اقبال اور کالی داس کی شاعری میں فطرت کی منظر کشی

''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور اس کے ذریعے ہم طرح طرح کے پھل نکال لاتے ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ پہاڑوں میں بھی سفید، سرخ اور گہری سیاہ دھاریاں پائی جاتی ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اور اسی طرح انسانوں، جانوروں اور مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہیں۔ حقیقت یہ کہ اللہ کے بندوں میں صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں۔''

(قرآن شریف کے سورۂ فاطر ۲۷، ۲۵، ۳۵)

قرآن شریف میں مطالعہ کائنات سے متعلق ۷۵۶ آیتیں ہیں جو اہلِ علم کو دعوتِ فکر دیتی ہیں۔ موجوداتِ کائنات میں پائی جانے والی خوبیوں کا جوہر جو ناظرین میں لذت اور سرور کی خاص کیفیت پیدا کرتا ہے، دراصل حسن کہلاتا ہے اور حسن کے مظاہر کو قبول کرنے کے رجحانات انسانوں میں عموماً اور تخلیق کاروں میں خصوصاً پیدائشی طور پر پائے جاتے ہیں۔ حسن کے مظاہر کو قبول کرنے کے بعد ہی تخلیق کار اشیاء کے مظہری پہلوؤں میں ایک طرح کی حقیقت نمود دینے کا کام کرتا ہے جسے فن کہا جاتا ہے۔ موسیقی، نغمہ و آہنگ، رنگ آمیزی یا تصویر کشی وغیرہ کچھ ایسے فنون ہیں جو ہماری پیشہ ورانہ اور کاروباری امور اور سیاسی و اقتصادی زندگی کے فرائض کو پورا کرنے میں ہونے والی محنت اور تھکن کو دور کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں اور ہماری پریشان و مضطرب زندگی کو ایک طرح کا سکون بخشتے ہیں۔ اسی لئے عظیم شاعر یا فن کار کچھ ایسی تخلیقات کو جنم دیتے ہیں جو خود ان کی حیات کی بقا کے لئے اتنی ضروری نہیں ہوا کرتیں لیکن پھر بھی ایسا کرتے ہوئے انہیں مسرت ضرور ہوتی ہے۔ اسی لئے ایک تخلیق کار اپنی فطری ذہانت کے سہارے ایک قسم کی شاہانہ فیاضیوں کا برملا اظہار کرتا رہتا ہے۔ ان تخلیق کاروں میں سنسکرت کے مہاکوی کالی داس اور اردو کے عظیم شاعر علاّمہ اقبال خاص اہمیت کے حامل ہیں جنہوں نے فطرت کا مطالعہ کیا ہے اور اس کے حسین مناظر کی ایسی تصویر کشی کی ہے جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی ہے۔ ان شعرا کی شاعری میں مناظر فطرت کی تصویر کشی کا تجزیہ کرنے سے پہلے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ کائنات کیا ہے؟ فطرت کسے کہتے ہیں؟ کیا فطرتِ کائنات واقعی بے حد حسین ہے؟ یا صرف ایک بدصورت مادہ ہے؟ فطرتِ کائنات اگر حسین ہے تو پھر حسن کیا ہے؟ ان تمام سوالوں کے جواب فلسفیوں اور صوفیوں نے دیا ہے۔ مطالعۂ کائنات فلسفیوں اور صوفیوں کا اہم موضوع رہا ہے۔ اس کے متعلق متعدد فلسفیوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً لائبنیز کے فلسفۂ مونادیت کے مطابق کائنات مونادوں کا ایک بڑا مجموعہ ہے۔ جو نہایت ہی سادہ، ناقابلِ تقسیم اور غیر فانی ہے۔ (واضح ہو کہ مونا دایک طرح کے مراکز قوت ہیں جن میں سے ہر وقت توانائی پھوٹتی رہتی ہے۔ مونادوں کو روحیتی ذرّات (Spiritual Atoms) بھی کہا جاتا ہے۔ لائبنیز کا یہ خیال کہ کائنات مونادوں کا مجموعہ ہے صحیح معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اس نے مونادوں کو روحیتی ذرّات یعنی Spiritual Atoms کہا ہے جو قوت کے مراکز ہیں اور جن سے توانائی نکلتی رہتی۔ جدید سائنسی تھیوریز (Theories) نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ مادے کا سب سے چھوٹا ذرّہ جسے تقسیم نہیں کیا جا سکے Atom کہلاتا ہے جس کے اندر بے شمار توانائی ہوتی ہے Atom کے اندر پائے جانے والے Electron, Proton and Nitron توانائی کے سرچشمے ہیں۔ لیکن لائبنیز کا یہ کہنا کہ کائنات نہایت سادہ ہے قابلِ قبول نہیں ہے کیوں کہ مونا دا گر مراکز توانائی ہے تو آفتاب کی ست رنگی روشنی، پہاڑ کی اونچی چوٹیوں سے بہتے ہوئے خوبصورت جھرنے کیا توانائی کے سرچشمے نہیں ہیں؟ اگر ہاں تو پھر کائنات سادہ کہاں ہے۔

برکلے نے بھی فطرتِ کائنات کے متعلق اپنا جونظریہ پیش کیا ہے وہ درست معلوم ہوتا ہے۔ وہ خارجی عالم کے وجود کوتسلیم کرتا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ تجربہ ہمیں اشیا کی صفات کا علم فراہم کرتا ہے اور صفات صرف ہمارے نفس یا ذہن کے تصورات ہیں۔ اس لئے فطرت کے متعلق وہ کہتا ہے کہ فطرت دراصل تصورات اور حسیات کا ایک نظام ہے جسے خدا کچھ خاص اصولوں کے تحت محدود اذہان میں پیدا کر دیتا ہے۔

فطرتِ کائنات کے سلسلے میں وھائیٹ ہیڈ نے بھی اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''گلاب کا پھول اپنے عطر کے لیے، بلبل اپنے سرور انگیز گیتوں کے لیے اور سورج اپنی درخشندگی کے لیے شاعرانہ تخئیل کے خوبصورت موضوعات بنتے رہے ہیں۔ مگر حقیقت تو یہ ہے کہ شعراء غلط فہمی کے شکار ہیں اور انھیں اپنی نظموں میں خود اپنی ذات کو موضوع داد و دہش بنانا چاہیے اور تحسین بالذات اور بالذات تشکر کے کلمات ادا کرنے چاہئیں کیونکہ یہ سارا حسن فطرت خود فطرت میں موجود نہیں، بلکہ یہ حسن تو خود انسانی ذہن کے عمل ادراک کا کمال و اعجاز ہے کہ وہ فطرت کو اس قدر خوبصورت اور خوشنما بنا کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ فطرت بالذات تو ایک بوجھل و مکدر صورت حال ہے، جس میں نہ تو کوئی رنگ و آہنگ ہے اور نہ ہی کوئی عالم بو و سرور ہے۔ نہ تو فطرت کوئی شئے چشیدنی ہے اور نہ ہی یہ کوئی عالم دیدنی ہے بلکہ فطرت تو بالذات ایک سریع التغیر چیز ہے جس کا کوئی سرا نہیں اور نہ ہی اس میں کوئی معنی و مفہوم ہیں۔ نہ ہی اس میں غایات و مقاصد ہیں۔''
>
> (بحوالہ قاضی قیصر الاسلام، فلسفے کے بنیادی مسائل، ص89-88)

وہائیٹ ہیڈ کے پہلے جملے میں ہی تضاد ہے۔ ایک طرف وہ کہتا ہے کہ'' گلاب کا پھول اپنے عطر کے لیے، بلبل اپنے سرور انگیز گیتوں کے لیے اور سورج اپنی درخشندگی کے لیے شاعرانہ تخئیل کے خوبصورت موضوعات بنتے رہے ہیں۔'' دوسری طرف وہ کہتا ہے کہ'' فطرت بالذات تو ایک بوجھل و مکدر صورت حال ہے، جس میں نہ تو کوئی رنگ و آہنگ ہے اور نہ ہی کوئی عالم بو و سرور ہے۔'' تو پھر گلاب کی خوشبو، بلبل کے سرور انگیز گیت اور سورج کی درخشندگی کیا فطرت کے حسین مناظر نہیں ہیں؟ اور اگر یہ حسین مناظر نہیں ہیں تو پھر شاعرانہ تخیل کے خوبصورت موضوعات کیسے بنتے رہے ہیں؟ البتہ وھائیٹ ہیڈ کا یہ کہنا درست ہے کہ'' یہ حسن تو خود انسانی ذہن کے عمل ادراک کا کمال و اعجاز ہے کہ وہ فطرت کو اس قدر خوبصورت اور خوشنما بنا کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔''

وھائیٹ ہیڈ کے نظریے سے اتفاق کرتے ہوئے کروچے نے حسن کے موضوعی نقطۂ نظر کی تائید کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

> ''حسن کلیتاً یا ذہن کا پیدا کردہ ہے۔ یعنی یہ کہ طبیعی اشیاء بجائے خود اپنے اندر ذاتی طور پر کوئی حسن نہیں رکھتیں۔ بلکہ ان اشیاء کے اندر حسن کا ادراک خود ہمارے ذہن کا اعجاز ہوا کرتا ہے۔ اور انھیں ہمارا ذہن ہی حسین، قبیح اور جلیل بناتا ہے۔'' (بحوالہ قاضی قیصر الاسلام، فلسفے کے بنیادی مسائل، ص:47-46)

حسن کے متعلق رسکن کا خیال ہے کہ ہم حسن کی حقیقت سے اس وقت واقف ہو سکتے ہیں جب ہم اپنے اندر خدا کے ہر کام میں حسن و جمال کا احساس کرنے لگ جائیں۔ لیگس نے حسن کو ایک جال قرار دیا ہے اور اس کا خیال ہے کہ اس سے قدرت عقل یا شعور کا شکار کرتی ہے۔

حسن کے متعلق بعض اہلِ علم حضرات کا خیال ہے کہ کوئی چیز صرف اسی قدر حسین ہوتی ہے، جس قدر کہ اس چیز کو اپنی نوع کے اعتبار سے ایک خاص تناسب حسن کا درکار ہوتا ہو۔ چنانچہ ہم کو مثالی حسن کا مکمل عرفان صرف اسی وقت ہو سکتا ہے، جب کہ ہم فنافی التصور ہو جائیں۔ یہ تصوّر ایک ایسا نقطۂ عروج ہے کہ جہاں تمام خواہشیں یا تمام ارادے ایک ارادۂ مطلق یا خواہش کلی میں ضم ہو کر ایک بڑے کل میں فنا ہو جاتی ہیں۔ ایک بڑے شاعر کا شدّتِ احساس ایک

خاص تناسب حسن والی اشیا کو دیکھنے کے بعد شدید ہو جاتا ہے یا وہ ان کے تصور میں اپنے آپ کو فنا کر لیتے ہیں اس لئے فطرتِ کائنات انہیں بے حد حسین نظر آتی ہے اور مناظر فطرت کی حسین تصویر کشی کرنے لگتے ہیں۔

وھائیٹ ہیڈ کے برخلاف ایمرسن کا خیال ہے کہ یہ کائنات بے حد خوبصورت ہے۔ ہمارے چاروں طرف سحر انگیز کیفیت کا جال سا بچھا ہوا ہے جو اپنی طرف ناظرین کو متوجہ کرتی رہتی ہے لیکن ہم دنیاوی اور کاروباری معاملات میں اس قدر الجھے رہتے ہیں کہ کائنات کا حسن ہمیں نظر نہیں آتا۔ اگر ہم پھر سے اپنے بچپن میں لوٹ جائیں اور ایک بچّے کی نظر سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ کائنات بے حد حسین ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتا ہے:

> ''ہمارے چاروں طرف کائنات کی سحر انگیز کیفیات نے ایک جال سا بنا رکھا ہے۔ اور ہم خوبصورتی کے سمندر میں گویا ڈوبے ہوئے ہیں لیکن بدقسمتی سے دنیاوی مسائل میں گرفتار ہونے کے باعث اور اپنے ماحول کا ہر روز نظارہ کرنے کی وجہ سے اس کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ ہماری آنکھیں کائنات کی رعنائیوں کے لیے اندھی ہو کر رہ گئی ہیں۔ اگر ایک لمحے کے لیے ہمارا بچپن واپس آجائے تو ہمیں اڑتے ہوئے طیور، چمکتے ہوئے تارے حیران نظروں والے پھول اور شفق کے لامثال رنگ ایک مسحور کن ترتیب کی صورت میں نظر آئیں اور ہم فرطِ طرب سے لرز اٹھیں۔'' (بحوالہ وزیر آغا، نظم جدید کی کروٹیں، ص-۲۷)

اس سلسلے میں ہیگل کا خیال ہے کہ کائنات ایک عالمِ متصورہ (The world of Ideas) ہے۔ اس کو ہم عالمِ فطرت کہتے ہیں۔ اس کے مطابق عالمِ فطرت دراصل افکار و تصورات کا ایک عالم خارجی ہے اور عقل مطلق (یعنی خدا) اپنے آپ کو اشکالِ خارجیہ میں تبدیل کر کے ہمارے سامنے عالمِ ظاہر کے طور پر ہر وقت پیش ہوتی رہتی ہے۔

ہیگل کے جدلیاتی تصور کے مطابق ''نفس کی دنیا''، یعنی مبدائے اوّل ہی اصل ہے اور مادہ نفس (یعنی مبدائے اوّل) کا مظہر ہے۔ ہیگل کہتا ہے کہ جدلیاتی عمل، نفس سے مادہ کی جانب نزول کرتا ہے گویا لطیف ترین تصور جب بلندی سے پستی کی طرف یا عروج سے زوال کی جانب آتا ہے تو لطیف ترین سے کثیف ترین صورت اختیار کر لیتا ہے اور یہ کثیف ترین صورت مادہ کہلاتی ہے جسے ہم عالمِ ظاہر کہتے ہیں اور جسے ہمارے حواس اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور ہم اس کا ادراک کرنے لگتے ہیں۔

صوفیائے کرام کے مطابق کائنات فطرت خدا کا عین ہے۔ ابنِ عربی نے اس سلسلے میں یہ آیت ''**کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق**'' (یعنی میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں اس لیے میں نے خلقت کو پیدا کیا)۔ گویا یہ تمام کائنات اسی وجود مطلق کی 'تجلّی' ہے۔ اگر فطرتِ کائنات واقعی خدائے مطلق کی تجلّی ہے تو یہ یقیناً بے حد حسین ہے۔ غالب بھی اس نظریے سے متفق ہیں اس لئے اس نظریے کی وضاحت کے لئے انہوں نے مختلف قسم کے الگ الگ رنگوں کے پھولوں کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ ان مختلف رنگوں میں بہار کا ثبوت ملتا ہے:

ہے رنگ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات ہے

یعنی موجوداتِ کائنات اپنے رنگ و روپ کے اعتبار سے مختلف ہیں لیکن ان سب میں خدا کا جلوہ موجود ہے۔

علامہ اقبال بھی اس نظریے کے قائل ہیں۔ مثلاً انھوں نے اپنی نظم ''ہمالہ'' میں 'ہمالہ' کو خدا کے جلوہ سے تعبیر کیا ہے:

ایک جلوہ تھا کلیمِ طور سینا کے لیے　　تو تجلّی ہے سراپا چشم بینا کے لیے

اس لئے فطرت کی منظر کشی کرتے وقت اکثر مقامات پر ان کا وجود فطرت میں فنا ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن فنا کے مقام سے جب واپس آتے ہیں تو ان پر یہ راز منکشف ہو جاتا ہے کہ کائناتِ فطرت اگر ایک جسم ہے تو انسان اس کی روح ہے اس لئے اقبال انسان کی عظمت کے قائل ہو جاتے ہیں اور فلسفۂ خودی جیسے نظریے کو پیش کرتے ہیں۔ دوسری طرف کالی داس جب رگھو ونشم، کمار سمبھوَ، میگھ دوتم اور ابھگیان شکنتلم جیسے مہا کاویہ کی تخلیق کر رہے تھے اس وقت ان کے ذہن میں موجودہ دنیا نہیں تھی جسے 'کل یگ' سے تعبیر کیا جاتا ہے بلکہ ان کے ذہن میں وہ دنیا تھی جسے ''ست یگ' کہا جاتا تھا اور جس دنیا میں تمام دیوی اور دیوتا چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ کالی داس کی نظر میں ''ہمالہ'' صرف ایک پہاڑ ہی نہیں بلکہ ایک دیوتا بھی تھا جس کی بیٹی پاروتی تھی۔ اس زمانے میں زمین سے سورگ لوک میں جانا اور وہاں سے واپس آجانا ایک عام بات تھی۔ پہاڑ کی وادیوں میں رنگ برنگ کے پھول کھلانے اور تمام گلستاں کو پھولوں کی خوشبو سے معطر کرنے کے لئے'' کام دیو'' بھی مامور کئے جاتے تھے۔ ایسی صورتِ حال میں کالی داس کی تخلیقات میں فطرت کی حسین مناظر کی تصویر کشی نہیں کی گئی ہوتی تو یہ حیرت کی بات ہوتی۔ اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ دونوں شاعروں نے فطرت کی جو منظر کشی کی ہے اس کی نوعیت کیا ہے؟ فطرت کے مناظر کو دلکش و دلفریب بنانے کے لئے کس طرح کی تشبیہات و استعارات کا استعمال کیا ہے۔ ایک ہی منظر کو دونوں شاعروں نے کس طرح پیش کیا ہے؟ ان تمام پہلوؤں کو جاننے کے لئے دونوں شاعروں نے فطرت کی جو تصویر کشی کی ہے اس کا تقابلی مطالعہ ضروری ہے۔

علاّمہ اقبال کی ابتدائی نظموں میں فطرت کی منظر کشی کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ بانگِ درا کی پہلی ہی نظم ''ہمالہ'' میں اقبال نے خوبصورت تشبیہات و استعارات کی مدد سے قدرت کا مطالعہ اور فطرت کے حسین مناظر کی تصویر کشی کرنے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کی شاعری بھی کی ہے۔ ہمالہ سے خطاب کرتے ہوئے اس کی جغرافیائی حالت، عظمت، اہمیت اور افادیت کی طرف بھی اشارے کئے گئے ہیں۔ اس نظم کا پہلا بند ہے:

اے ہمالہ! اے فصیل کشورِ ہندوستاں!　　چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں　　تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں

اس بند کے پہلے ہی مصرعے میں ''فصیل کشورِ ہندوستاں'' کہہ کر اقبال نے ہمالہ کی وسعت اور پھیلاؤ کا منظر پیش کرنے کے ساتھ اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے کہ ہندوستان کی وہ سرحدیں جو خشکی میں ہیں، ہمالہ کے لمبے سلسلے سے گھری ہوئی ہیں۔ اسی بات کو کالی داس نے اپنی تخلیق ''کمار سمبھوَ'' میں پہلے سرگ کے پہلے شلوک میں اس طرح کہی ہے کہ بھارت کے شمال میں دیوتا کی طرح عبادت کے لائق ہمالہ نام کا بڑا بھاری پہاڑ ہے جو مشرق اور مغرب کے سمندری ساحل تک پھیلا ہوا ایسا لگتا ہے جیسے وہ اس سرزمین کو ماپنے اور تولنے کا میزان ہو۔ کالی داس نے ہمالہ کو دیوتا کی طرح لائقِ عبادت کہہ کر ہندو مائیتھولوجی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس کے مطابق ہمالہ صرف ایک پہاڑ ہی نہیں ہے بلکہ بھگوان شیو کی اہلیہ پاروتی کے جنّی (تخلیق کا سرچشمہ) بھی ہیں۔ اقبال نے بھی کہا ہے کہ اہلِ بینا کے لئے ہمالہ سراپا تجلّیٔ خدا ہے:

تو تجلّی ہے سراپا چشم بینا کے لیے

اقبال نے جب یہ کہا ہے کہ آسمان اس کی بلندی کو جھک کر چومتا ہے تو اس سے نہ صرف اس کی بلندی ظاہر ہوتی ہے بلکہ زمین سے آسمان تک کا نظارہ آنکھوں میں گھومنے لگتا ہے اور ساتھ ہی زمین و آسمان کی دوری بھی مٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح ہمالہ کو یہ کہہ کر کہ'' تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں'' اس کے مناظر کو مزید دلفریب بنا دیا ہے کیوں کہ جوانی سے زیادہ پُرکشش کوئی اور چیز نہیں ہوتی۔ ایک دوسرے شعر میں علاّمہ اقبال نے ہمالہ پہاڑ کے نظارے پیش کرنے کے لیے اس کی چوٹیوں کو ثریّا سے سرگوشی کرتے ہوئے دکھایا ہے اور یہ کہا ہے کہ زمین پر ہوتے ہوئے بھی ہمالہ کا وطن آسمان

ہے۔اس سے نہ صرف ہمالہ کی بلندی کا احساس ہوتا ہے بلکہ ہمالہ کی وادیوں سے چوٹیوں تک اور چوٹیوں سے تاروں کی انجمن تک کے مناظر آنکھوں میں پھرنے لگتے ہیں:

چوٹیاں تیری ثریّا سے ہیں سرگرم سخن
تو زمیں پر اور پنہائے فلک تیرا وطن

شاعر نے اس کے علاوہ ہمالہ کے دامن میں پائی جانے ولی کالی گھٹاؤں، چشموں اور ہوا کے جھونکوں کی بھی انتہائی خوبصورت منظر کشی کی ہے۔فطرت کے ان حسین مناظر کی تصویر کشی کرنے کے لیے شاعر نے ہمالہ کی گود میں پائے جانے والے چشموں کے پانی کو صاف اور شفاف بتانے کے لیے اس کی سطح کو آئینۂ سیّال قرار دیا ہے جس میں فطرت اپنی تصویر دیکھا کرتی ہے:

چشمۂ دامن ترا آئینۂ سیّال ہے

آئینے میں جب کوئی حسینہ اپنے حسن کو دیکھتی ہے تو اس کے چہرے پر ایک عجیب وغریب کیفیت طاری ہونے لگتی ہے مثلاً نپولین کی بہن پولائن نے مرتے وقت آئینہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور جب اسے آئینہ پیش کیا گیا تو آئینہ میں دیکھتے ہوئے کہا تھا کہ خدا کا شکر ہے میں اب بھی خوبصورت ہوں۔اس لئے آئینہ دیکھنے کے بعد کی کیفیت کو بیان نہیں کیا جا سکتا صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔لیکن فطرت جو انتہائی حسین ہے اس پر کیا گزرتی ہوگی جب وہ اپنے حسن کو آئینے میں دیکھتا ہوگا۔اقبال کا یہ شعر:

حسن آئینۂ حق، دل آئینۂ حسن
دلِ انساں کو ترا حسنِ کلام آئینہ

بھی اس کی تائید کرتا ہے۔کالی داس نے کیلاش پربت کی گود میں بسی ہوئی 'الکاپوری' کی تشبیہہ عاشق کی گود میں بیٹھی ہوئی ''کامنی'' سے اور وہاں سے نکلنے والی گنگا کی دھار کی تشبیہہ اس کامنی (یعنی الکاپوری) کے جسم سے ڈھلکی ہوئی ساڑی سے اور پھر الکاپوری پر بارش کے دنوں میں برستے ہوئے بادل کے سایے کی تشبیہہ کامنیوں کے سر پر موتی گتھے ہوئے جُڑے سے دے کر الکاپوری کی نہ صرف خوبصورت تصویر کشی کی ہے بلکہ گنگا کی دھار، برستے ہوئے بادل اور بادلوں کے سایے کے اثرات اور موتی جڑے ہوئے کامنیوں کے جُڑوں کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ تمام مناظر حرکت کرتے ہوئے آنکھوں میں پھرنے لگتے ہیں۔کالی داس نے الکاپوری کو کامنی سے تعبیر کر کے پہلے قاری کی جنسی تلذذ کو بیدار کیا اور پھر اس کے بدن سے اس کی ساڑی کو سرکا کر قاری کی جنسی خواہش کو بھڑکا دیا اور وہاں کے پوری فضا میں رومان اور سرمستی کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے۔۶۷ ویں شلوک میں کالی داس نے لکھا ہے:

> ''ہے کام چارنی! اس کیلاش پروت کی گود میں الکاپوری ویسے ہی بسی ہوئی ہے جیسے اپنے پیارے کی گود میں کوئی کامنی بیٹھی ہو۔وہاں سے نکلی گنگا جی کی دھارا ایسی لگتی ہے، مانو اس کامنی کے شریر پر سے سرکی ہوئی اس کی ساڑی ہو۔یہ نہیں ہوسکتا کہ ایسی الکا کو دیکھ کر تم پہچان نہ پاؤ۔اُونچے اُونچے بھونوں والی الکا پوری پر ورسا کے دنوں میں برستے ہوئے بادل کامنیوں کے سر پر موتی گُتھے ہوئے جُڑے جیسے چھائے رہتے ہیں۔'' (کالی داس-گرنتھاولی،ص-۳۰۹)

اقبال نے ہمالہ کی رونق اور چمک کو ظاہر کرنے کے لیے اور آلودگی سے پاک وہاں کی ہواؤں کی اہمیت کو بتانے کے لیے اسے ہمالہ کا رومال قرار دیا ہے:

دامن موجِ ہوا جس کے لیے رومال ہے

اسی نظم کے ایک اور بند میں شاعر نے فطرت کے حسین مناظر کی تصویر اس حسن وخوبی سے کی ہے کہ پہاڑ کی وادی میں نہ صرف حرکت پیدا ہوگئی ہے بلکہ محاکات کی عمدہ مثال بھی ہے جس سے وہاں کے تمام مناظر آنکھوں میں رقص کرنے لگتے ہیں۔ ہمالہ کی وادی میں کالی گھٹاؤں کو گھڑ سوار، تیز ہوا کے جھونکوں کو گھوڑے اور بجلی کی چمک کو چابک سے تعبیر کر کے ہمالہ کی وادی کو بازی گاہ بنا دیا ہے جہاں فطرت کے عناصر ہمہ وقت مختلف کھیلوں میں مصروف رہتے ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں شاعر نے ہوا میں اڑتی ہوئی کالی گھٹاؤں کو اس مست ہاتھی سے جس کے پاؤں میں زنجیر نہ ہو سے تشبیہہ دے کر عجیب وغریب نظارہ پیش کیا ہے:

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے　　تازیانہ دے دیا برقِ سرِ کوہسار نے
اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی، جسے　　دستِ قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لیے

ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیل بے زنجیر کی صورت اُڑا جاتا ہے ابر

ایسے ہی نادر تشبیہات کالی داس نے بھی اپنی تخلیق میگھ دوتم میں بڑے آب وتاب سے استعمال کیے ہیں۔ پُروَمیگھ، شلوک۔ ۲، میں کالی داس نے پہاڑ کی چوٹی سے لپٹے ہوئے بادل کی تصویر کشی کرتے ہوئے اس کی تشبیہہ ہاتھی سے دی ہے۔ یکچھ کے متعلق لکھتے ہیں:

''اساڑھ کے پہلے ہی دن وہ دیکھتا کیا ہے کہ سامنے پہاڑی کی چوٹی سے لپٹا ہوا بادل ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی ہاتھی اپنے ماتھے کی ٹکر سے مٹی کے ٹیلے کو ہٹانے کا کھیل کھیل رہا ہو۔''

کالی داس نے ہوا کے جھونکوں سے اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے بادلوں کی تشبیہ مٹّی کے ٹیلوں کو اپنے ماتھے سے مار مار کر ہٹانے کا کھیل کھیلتے ہوئے ہاتھی سے دے کر موثر انداز میں فطری منظر کشی کی ہے۔ علامہ اقبال نے ایسے بادلوں کو فیلِ بے زنجیر کہا ہے اور پہاڑی علاقوں کو بازی گاہ یعنی کھیل کا میدان قرار دیا ہے جہاں فطرت ہاتھی اور گھوڑوں کا کھیل کھیلا کرتی ہے۔ ایک دوسرے بند میں صبح کی ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے اور ان جھونکوں کے اثرات سے پھولوں کی کلیوں پر جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کو انتہائی شاعرانہ انداز میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ صبح کی ٹھنڈی ہواؤں نے کلیوں پر ایسا اثر ڈالا کہ زندگی کے نشے میں ہر پھول کی کلی جھومتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ زندگی کے نشے میں پھول کی کلیوں کا جھومنا انتہائی لطیف خیال ہے۔

جنبشِ موجِ نسیمِ صبح گہوارہ بنی
جھومتی ہے نشّہ ہستی میں ہر گل کی کلی

مثنوی سحر البیان کے مصنف میر حسن نے بھی ایک باغ کا منظر اس طرح کھینچا ہے:

گلوں کا لبِ نہر وہ جھومنا
اسی اپنے عالم میں منھ چومنا
وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر
نشے کا سا عالم گلستان پر

کالی داس نے اپنی تخلیق رگھو ونشم میں موسمِ بہار کا نقشہ پیش کرتے ہوئے کچھ ایسی ہی منظر کشی کی ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ اچانک نوخیز

منجری (flower of mango tree) سے بھرے آم کے پیڑ کی ڈالیاں، ہمالہ سے آتی ہوئی ہواؤں سے ایسی جھوم اٹھتی ہیں جیسے انہوں نے اداکاری سیکھنا شروع کر دیا ہو اور انہیں دیکھ کر حسد اور کدورت سے دور رہنے والے یوگیوں کا دل بھی جھوم اٹھا۔ (نواں سرگ، ۳۳واں اشلوک، ص-۸۱)

علامہ اقبال نے پودوں اور پھولوں کی پتیوں کو زبان سے تشبیہہ دے کر ان کی خاموشی میں قوتِ گویائی پیدا کر دی ہے اور تمام پھول یہ کہنے لگے ہیں کہ گلچیں کے ہاتھوں کی رسائی آج تک ان پھولوں تک نہیں ہو سکی۔

یوں زبانِ برگ سے گویا ہے اس کی خامشی
دست گلچیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی

اسی نظم کے ایک اور بند میں شاعر نے پہاڑ کی بلندی سے جو ندیاں راستے میں پڑے چٹانوں اور پتھروں سے ٹکراتی ہوئی نیچے آتی ہیں ان کی نہ صرف خوبصورت منظر کشی کی ہے بلکہ ان ندیوں کو جنّت کی ندیوں کوثر و تسنیم سے بہتر قرار دیا ہے جس میں قدرت اپنے آپ کو دیکھتی رہتی ہے کہ اس کے مناظر کس قدر حسین ہیں ساتھ ہی ان ندیوں سے نکلنے والی آواز کو موسیقی سے تعبیر کیا ہے۔ ساتھ ہی راستے کے نشیب و فراز سے ٹکراتی ہوئی اور مسلسل اپنی منزلیں طے کرتی ہوئی ندیوں سے فلسفۂ زندگی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے:

آتی ہے ندّی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی　　کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی　　سنگِ رہ سے گاہ بچتی، گاہ ٹکراتی ہوئی

چھیڑتی جا اس عراقِ دل نشیں کے ساز کو
اے مسافر! دل سمجھتا ہے تری آواز کو

وادیٔ کہسار کی شام کی منظر کشی کرتے ہوئے شام میں پھیلتی ہوئی سیاہی کو اندھیری رات کے زلفِ رسا سے تعبیر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لیلیٰ شب کوئی جیتی جاگتی دلہن ہو جس نے اپنے بالوں کو کھول کر اپنے حسن میں اضافہ کر لیا ہو اور اس حسین مناظر میں آبشاروں کی آواز دل کو اپنی طرف کھینچ رہی ہو۔ شاعر نے اس پر فریب شام میں چاروں طرف چھائی ہوئی خاموشی کو یہ کہہ کر: ''وہ خموشی شام کی جس پر تکلّم ہو فدا'' شام کے وقت کی خاموشی کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے۔ عام طور پر رات کی خاموشی کو وحشت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے لیکن اقبال نے اس کی اہمت کو justify کرنے کے لیے پیڑ پودوں اور درختوں پر چھائی ہوئی شام کی خاموشی کو فکری استغراق سے جوڑ کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بند ملاحظہ کیجئے:

لیلیٰ شب کھولتی ہے آ کے جب زلفِ رسا　　دامن دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلّم ہو فدا　　وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا

برف سے ڈھکی ہوئی ہمالہ کی چوٹیوں پر آفتاب کی پہلی کرن جب پڑتی ہے تو اس کا حسن دید کے قابل ہوتا ہے۔ اقبال نے اس حسین منظر کی نہ صرف تصویر کشی کی ہے بلکہ چوٹیوں کو 'سر' اور برف کو دستارِ فضیلت سے تعبیر کر کے ہمالہ کی اہمیت اور بڑھا دی ہے۔

برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کُلاہِ مہرِ عالم تاب پر

اسی طرح غروب آفتاب کے وقت پہاڑوں پر پڑنے والے شفق رنگ اور اس سے ابھرنے والے مناظر کی تصویر کشی اقبال نے انتہائی خوبصورت انداز سے کی ہے۔

کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر
خوش نما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

شاعر نے شعر کے پہلے مصرعے میں رنگ شفق کو کانپتے ہوئے دکھا کر عجیب وغریب منظر پیش کیا ہے اور دوسرے مصرعے میں شفق رنگ کو غازہ سے اور پہاڑ پر جمی ہوئی برف کو رخسار سے تعبیر کرنا انتہائی لطیف خیال ہے۔

اقبال نے جس طرح ہمالہ، گلِ رنگیں، آفتابِ صبح، چاند، جگنو، شمع اور بزمِ انجم وغیرہ نظموں میں فطرت کا مطالعہ پیش کیا ہے اور قدرت کے حسین مناظر کی تصویر کشی کی ہے اسی طرح نظم ''ابرِ کوہسار'' میں بھی فطرت کا مطالعہ کیا ہے اور خوبصورت تشبیہوں اور استعاروں کی مدد سے قدرت کے حسین مناظر کی بے حد خوبصورت تصویر کھینچی ہے۔ اس نظم میں شاعر نے تمثیلی اندازِ بیان اختیار کرتے ہوئے کوہسار کے بادل کو جاندار کی صورت میں پیش کیا ہے اور بادل کی زبانی اس کی تمام خوبیوں کو بیان کیا ہے اور بادل کی وجہ سے پہاڑ کی وادیوں میں جو حسین مناظر نظر آتے ہیں ان کی تصویر کشی کی ہے۔

شاعر نے یہ کہہ کر کہ ابرِ کوہسار کے دامن میں چاروں طرف پھول بکھرے ہوئے ہوتے ہیں اور پہاڑ کی وادیوں کے ہرے بھرے گھاس کو مخمل کے بچھونے سے تشبیہ دے کر نہ صرف پہاڑ کی وادیوں کی حسین منظر نگاری کی ہے بلکہ ابرِ کوہسار کی اہمیت کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے:

ہے بلندی سے فلک بوس نشیمن میرا ابر کہسار ہوں گل پاش ہے دامن میرا
کبھی صحرا، کبھی گلزار ہے مسکن میرا شہر و ویرانہ مرا، بحر مرا، بن میرا

کسی وادی میں جو منظور ہو سونا مجھ کو
سبزۂ کوہ ہے مخمل کا بچھونا مجھ کو

دراصل بارش کی وجہ سے ہی کسانوں کی کھیتی اور میدانوں کے سبزے لہلہاتے ہیں۔ لیکن اس بات کو کہنے کے لیے شاعر نے جو پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ اس بند کا پہلا مصرع ملاحظہ کیجیے:

مجھ کو قدرت نے سکھایا ہے دُر افشاں ہونا ناقۂ شاہد رحمت کا حُدی خواں ہونا
غم زدائے دلِ افسردۂ دہقاں ہونا رونق بزمِ جوانانِ گلستاں ہونا

دُر افشاں (یعنی موتی) بلبلے کا استعارہ بالکنایہ ہے۔ اس استعارے سے مصرعے میں جہاں حسن پیدا ہوا ہے وہیں بارش کے وقت کھیتوں اور میدانوں کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ کالی داس نے میگھ دوتم میں ایک جگہ بارش کے دنوں میں بادل اور بادل سے لپٹے ہوئے قوس وقزح (اندر دھنش) کی منظر کشی کی ہے اور اس کے ساتوں رنگوں کو قیمتی جواہرات سے تعبیر کیا ہے۔ اس رنگین فضا میں بادلوں کے سانولے رنگ کو کرشن جی کے چہرے کے رنگ سے اور اندر دھنش کے رنگوں کو کرشن جی کے تاج سے مشابہ قرار دے کر عجیب وغریب کیفیت پیدا کر دی ہے۔ پندرہویں شلوک میں لکھتے ہیں:

''دیکھو! سامنے سورج کی کانتی سے پربھاوِت میگھ اٹھا ہوا اندر دھنش کا وہ ٹکڑا ایسی خوبصورت دکھائی پڑ رہا

ہے، جیسے بہت سے جواہرات کی چمک ایک ساتھ یہاں لا کر اکٹھی کر دی گئی ہو۔اس اندر دھنش سے سجا ہوا تمہارا سانولا جسم اتنا خوبصورت لگنے لگا ہے جیسے مور مکٹ پہنے اور گوالے کا بھیس بنائے ہوئے خود شری کرشن آ کھڑے ہوئے ہوں۔'' (کالی داس-گرنتھاولی،ص-۳۰۱)

اس بند کے دوسرے مصرعے میں بادل کو شاہدِ رحمت اور ناقۂ حُدی خواں سے تعبیر کر کے بادل کی آواز کو نغمہ قرار دیا گیا ہے جس کی تاثیر سے ریگستان میں اؤنٹ کی رفتار تیز ہو جاتی ہے اور اس طرح بادل کے گرجنے کی تصویر بھی سامنے آ جاتی ہے۔کالی داس نے بھی بادلوں کے گرجنے اور اس کی گرجن سے ڈر کر محبوب کے آپس میں گلے سے لپٹنے کا بھی نقشہ کھینچا ہے اور بادلوں کی آواز کو دو چاہنے والے جوڑوں کے درمیان کی دوری ختم کرنے والا نغمہ قرار دیا ہے۔ ۲۳ ویں شلوک میں کالی داس نے لکھا ہے:

''اور دیکھو! برسات کی بوندوں کو اُوپر ہی اُوپر سے چونچ میں لے لینے چتُر چاتکوں اور جھنڈ باندھ کر اُڑتی ہوئی چاتکیوں کو گناتے ہوئے سِدھ جن، جب تم وہاں پہنچ کر گرجنے لگو گے تو سِدھانڈنائیں گھبرا کر اپنے اپنے محبوب سے لپٹ جائیں گی۔اس گھبراہٹ بھرے ہم آغوش کو پا کر وہ تمہارا احسان مانیں گے۔''
(کالی داس-گرنتھاولی،ص-۳۰۲)

اقبال کے اس بند کا یہ مصرع استعارہ بالکنایہ کی بہترین مثال ہے۔اس بند کا یہ آخری شعر قابلِ توجہ ہے:

بن کے گیسو رخِ ہستی پہ بکھر جاتا ہوں
شانۂ موجۂ صرصر سے سنور جاتا ہوں

اس شعر میں شاعر نے بادل کو گیسو سے تشبیہہ دے کر اس سرزمین کو خوبصورت حسینہ بنا دیا ہے اور پھر گیسو کی رعایت سے یہ کہہ کر کہ بادل'' شانۂ موجۂ صرصر سے سنور جاتا ہے'' ہوا کو حسینہ کے کندھے سے تعبیر کیا ہے جو انتہائی بلیغ ہے۔کیوں کہ ہوا کے تیز جھونکوں سے آسمان میں بادلوں کے بکھرنے اور پھر بکھر کر سنورنے کے منظر کی تصویر کشی اس سے زیادہ خوبصورت انداز میں ممکن نہیں ہے۔

علاّمہ اقبال نے اس سرزمین کو ایک دلہن قرار دیا اور کالے کالے بادلوں کو دلہن کی زلف سے تعبیر کیا ہے جو ہوا کے جھونکوں سے دلہن کے کندھوں پر کبھی بکھر جاتی ہیں تو کبھی سنور جاتی ہیں۔کالی داس نے بھی میگھ دوت میں ایک جگہ کہا ہے کہ بادل جب ہوا کے کندھوں پر سوار ہو کر اُوپر اٹھے گا تو الکاپوری کی وہ تمام عورتیں جن کے شوہران سے دور ہیں اپنے لمبے بالوں کو اوپر اٹھا کے بڑے بھروسے سے تمہیں دیکھیں گی۔کھلے ہوئے کالے بال گھنے بادلوں کی علامت ہے تو دوسری طرف یہ جدائی اور غم کی بھی علامت ہے۔

کالی داس نے ایک جگہ اور کالے کالے بادلوں کو کہیں نرم و نازک جُڑوں سے تو کہیں پہاڑوں میں پائے جانے والے جواہرات اور کہیں موتیوں سے بھرے ہوئے کامنیوں کے جُوڑوں سے تشبیہ دی ہے۔کالی داس نے میگھ دوتم کے پہلے سرگ کے اٹھارہویں شلوک میں کہا ہے کہ پکے ہوئے پھلوں سے لدے آم کے پیڑوں سے گھرا ہوا آمرکوٹ پہاڑ پیلا ہوگا۔اس کی چوٹی پر جب تم (بادل) نازک بالوں کی جڑوں کی طرح سانولا رنگ لے کر چڑھو گے تب وہ پہاڑی دیوتاؤں کی بیویوں کو دور سے ایسے دکھائی دے گا جیسے وہ زمین سے اٹھا ہوا ایسا جوہر ہو جس کے بیچ میں سیاہ اور چاروں طرف زرد ہو۔اسی طرح ۶۷ واں شلوک میں وہ کہتے ہیں کہ اُونچے اُونچے محلوں والی الکاپوری پر برسات کے دنوں میں برستے ہوئے بادل' کامنیوں' کے سر پر موتی گتھے ہوئے جُوڑوں کی مانند چھائے رہتے ہیں۔

تیسرے بند میں بھی بادل اور بارش کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس مضمون کو نئے نئے انداز میں باندھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بظاہر شاعر صرف یہ کہنا چاہتا ہے کہ بادل کہیں برستا ہے اور کہیں نہیں برستا ہے۔ لیکن جہاں برستا ہے وہاں کی نہر کو بھنور کی بالیاں پہنا تا ہے۔ دراصل پانی کی بوندوں سے نہر میں جو بھنور پیدا ہوتا ہے اسے شاعر نے بالیوں سے تعبیر کیا ہے۔ نہر کو گرداب کی بالیاں پہنانا صرف Poetic description ہے۔ اس مصرعے سے بھی بارش کی خوبصورت تصویر کشی کی گئی ہے۔ شاعر آگے کہتا ہے کہ اگر کسی جگہ سے بغیر برسے ہوئے بادل گزر جاتا ہے تو وہاں کے لوگ مایوس ہو جاتے ہیں اور بارش کے لیے ترسنے لگتے ہیں کیوں کہ بادل نوخیز سبزے کی امید ہے یعنی جو سبزہ ابھی ابھی زمین سے اگتا ہے وہ پانی کی کمی سے سوکھ جاتا ہے۔ اس لیے اس کی زندگی کا دارومدار بارش پر ہے۔ اس بند کے آخری مصرعے میں شاعر نے بادل کے بننے کی سائنسی وجوہات کی طرف روشنی ڈالی ہے۔ بند ملاحظہ کیجیے:

دور سے دیدۂ امید کو ترساتا ہوں　　کسی بستی سے جو خاموش گزر جاتا ہوں
سیر کرتا ہوا جس دم لب جو آتا ہوں　　بالیاں نہر کو گرداب کی پہناتا ہوں

سبزۂ مزرعِ نوخیز کی امّید ہوں میں
زادۂ بحر ہوں، پروردۂ خورشید ہوں میں

بندھیاچل پہاڑ کی چوٹی (جسے نیچ بھی کہا جاتا ہے) پر کھِلے ہوئے کدمھ کے پیڑ اور بادلوں کے دیدۂ امید کے خواہش مند، ان پیڑوں کی بے قراری اور اس پہاڑ کے غاروں سے خوشبودار اشیا سے نکلتی ہوئی خوشبو کو بھی کالی داس نے محسوس کیا ہے۔ وہاں کے بازارِحسن کی عورتوں کے ذریعے جنسی لذت حاصل کرتے وقت ان خوشبوؤں کا صحیح استعمال کئے جانے کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔ ۲۷ ویں شلوک میں لکھا ہے:

''ہے مِتر! وہاں پہنچ کر تم تھکاوٹ مٹانے کے لئے 'نیچ' نام کی پہاڑی پر اُتر جانا۔ وہاں پر پھولے ہوئے کدمب کے پیڑوں کو دیکھ کر ایسا لگے گا کہ تم سے ملنے کے لئے ان کے روم روم پھڑ پھڑا اُٹھے ہوں۔ اس پہاڑی کی گپھاؤں میں سے ان خوشبودار اشیا کی خوشبو نکل رہی ہو گی، جنہیں وہاں کی رسک (عاشق مزاج) ویشیاؤں کے ساتھ ہم بستری کرنے کے وقت کام میں لاتے ہیں۔ اس سے تمہیں یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ وہاں کے شہری کتنی آزادی سے جوانی کے مزے لیتے ہیں۔''
(کالی داس-گرنتھاولی، ص-۳۰۳)

نِروندھیاندی کی اُچھلتی ہوئی لہروں اور ان لہروں پر کردھنی سی دکھائی دینے والی چڑیوں کی چہکتی ہوئی قطاروں کی تصویر کشی کے علاوہ رُک رُک کر بہنے والی لہروں اور ان میں پڑی ہوئی بھنور (گرداب) کو عورتوں کی ناف سے اور بل کھاتی ہوئی ندی کی لہروں کو عورتوں کی اداؤں سے تشبیہ دے کر کالی داس نے پورے منظر کو دلفریب بنا دیا ہے۔ ۳۰ ویں شلوک میں لکھتے ہیں:

''ہے مِتر! اُجّینی کی طرف جاتے ہوئے تم اُتر کر اس نِروندھیاندی کا بھی رس پی لینا، جس کی اُچھلتی ہوئی لہروں پر چڑیوں کی چہکتی ہوئی پنکتیاں کردھنی سی دکھلائی دیں گی۔ جو بہت خوبصورت ڈھنگ سے رُک رُک کر بہہ رہی ہوں گی اور اس میں پڑا ہوا بھنور تمہیں اس کی نابھی جیسی دکھائی دے گا۔ کیوں کہ عورتیں ہاؤ بھاؤ کے ذریعے ہی اپنے محبوب کو محبت کی بات بتلاتی ہیں۔'' (کالی داس-گرنتھاولی، ص-۳۰۳)

آخری مصرعے میں اقبال نے سائنس کے اس نقطے کو پیش کیا کہ سورج کی گرمی سے سمندر کا پانی بھاپ بن کر اُوپر اڑتا ہے یہی بھاپ جب بہت اُوپر چلی

جاتی ہے تو ٹھنڈی ہو کر بادل بن جاتی ہے اور یہی بادل ہوا کا دباؤ بڑھ جانے سے برسنے لگتا ہے۔ اسی لیے شاعر نے بادل کو سمندر کا بیٹا اور سورج کو پروردہ کہا ہے۔

آخری یعنی چوتھے بند میں بھی شاعر نے بادل کی فضیلت کو خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے جس سے پہاڑی علاقوں، پہاڑی ندیوں پہاڑ کے آس پاس کے میدانوں، ان میدانوں میں کھلے ہوئے پھولوں اور اس علاقے میں بنے ہوئے جھونپڑوں کا منظر آنکھوں کے سامنے پیش کر دیا ہے اور ساتھ ساتھ بادل کی اہمیت کا احساس اپنے قاری کو کرا دیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ پہاڑ کے جھرنوں میں سمندر جیسی جو ہلچل ہے وہ بادل نے عطا کی ہے۔ شاعر نے یہ بتا کر کہ پرندے بادل کی آواز میں محو ہو جاتے ہیں، بادل کی آواز کو نغمہ قرار دے دیا ہے۔ اس بند کے تیسرے مصرعے میں شاعر نے بادل کو حضرتِ عیسیٰؑ قرار دے دیا ہے یعنی جس طرح عیسیٰؑ الیہ اسلام مردوں کو زندہ کر دیتے تھے اسی طرح بادل بھی سبزے کو ہرے بھرے ہو جانے کے لیے حکم دیتا ہے۔ شاعر آگے کہتا ہے کہ بادل صرف غنچوں کو کھلنا ہی نہیں سکھاتا بلکہ اپنی رحمت سے کسانوں کے جھونپڑوں میں وہی خوشی پیدا کر دیتا ہے جو خوشی محلوں میں پائی جاتی ہے۔

چشمۂ کوہ کو دی شورش قلزم میں نے　　اور پرندوں کو کیا محو ترنّم میں نے
سر پہ سبزہ کے کھڑے ہو کے کہا قم میں نے　　غنچۂ گل کو دیا ذوقِ تبسم میں نے

فیض سے میرے نمونے ہیں شبستانوں کے
جھونپڑے دامن کہسار میں دہقانوں کے

کالی داس نے آمرکوٹ کے جنگل اور جنگل میں کدمب کے پیڑ اور اس کے پھولوں کے علاوہ ان پر منڈلاتے ہوئے بھنورے، دلدل میں کھلے ہوئے کمل کے پھول، پتیوں اور ان پتیوں کو چرتے ہوئے ہرن، زمین کی سوندھی خوشبو اور ان خوشبوؤں کو سونگھتے ہوئے ہاتھیوں کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ جنگل میں ایک طرح کی ہلچل پیدا کر دی ہے۔ بائیسویں شلوک میں لکھتے ہیں:

''اور پھر جس سمے تم پانی برساتے ہوئے چلے جا رہے ہوں گے اس وقت ادھ پکے اور ہرے پیلے کدمب کے پھولوں پر منڈلاتے ہوئے بھنورے، دلدلوں میں نئی پھولی ہوئی کمل کی پتیوں کو چرتے ہوئے ہرن اور جنگلی دھرتی کی سوندھی خوشبو سونگھتے ہوئے ہاتھی تمہیں راستہ بتلائیں گے۔''
(کالی داس-گرنتھاولی، ص-۳۰۲)

بارش کی بوندوں کا انتظار نہ صرف پھولوں اور پودوں کو ہوتا ہے بلکہ آسمان میں اُڑتے ہوئے پرندوں کو بھی ہوتا ہے۔ بعض پرندے سواتی نکچھتر پہلے بوند کو پی کر حاملہ ہوتے ہیں۔ کالی داس نے جھنڈ کے جھنڈ آسمان میں اڑتے ہوئے ان پرندوں کی بھی منظر کشی کی ہے جو بارش کی بوندوں کو زمین پر گرنے سے پہلے ہی اپنی چونچ میں روک لیتی ہیں۔ ۲۳ ویں شلوک میں کالی داس نے لکھا ہے:

''اور دیکھو! برسات کی بوندوں کو اُوپر ہی اُوپر سے چونچ میں لے لینے چتُر چاتکوں اور جھنڈ باندھ کر اُڑتی ہوئی چاتکیوں کو گناتے ہوئے سِدھ جن، جب تم وہاں پہنچ کر گرجنے لگو گے تو سِدھانڈنائیں گھبرا کر اپنے اپنے محبوب سے لپٹ جائیں گی۔''　　(کالی داس-گرنتھاولی، ص-۳۰۲)

کالی داس نے پھولوں سے لدے ہوئے پہاڑ، پہاڑ پر بادلوں کے انتظار میں آنکھوں میں آنسو لئے کوئل اور ان کی کُوک کی بھی منظر کشی کی ہے۔ ۲۴ ویں شلوک میں لکھا ہے:

''ہے مِتر! میں جانتا ہوں کہ تم میرے کام کے لئے بغیر رُکے جلد جانا چاہو گے پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ کُوٹج کے پھولوں سے لدے ہوئے ان خوشبودار پہاڑوں پر تمہیں رکتے ہوئے ہی جانا ہوگا کیوں کہ وہاں کے مور آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھر کر اپنی کوک سے تمہارا خیر مقدم کر رہے ہوں گے۔''

(کالی داس-گرنتھاولی،ص-۳۰۲)

الکانگری کے راستے میں پڑنے والے دشارن نام کے ایک دیش کے گلشن اور گلشن میں کھلے ہوئے پھول اور خاص کر کیوڑے کے سفید پھولوں سے آراستہ سفید گلشن کی تخلیق کی اور پھر ان کی تصویر کشی کی ہے۔وہاں کے گاؤں کے مندروں میں لٹکتی ہوئی چڑیوں کے گھونسلوں، وہاں کے جنگلوں میں پکی ہوئی جامنوں کے پیڑ اور باہر سے آئے ہوئے ہنسوں کی بھی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ تمام منظر آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔۲۵ویں شلوک میں لکھا ہے:

''ہے مِتر! جب تم دشارن دیش کے پاس پہنچو گے تب وہاں کی پھولی ہوئی پھلواریاں پھولے ہوئے کیوڑے کی وجہ سے سفید دکھائی دیں گی۔گاؤں کے مندر کوّا وغیرہ چڑیوں کے گھونسلوں سے بھرے ملیں گے۔وہاں کے جنگل پکی ہوئی کالی جامنوں سے لدے ملیں گے۔اور ہنس بھی وہاں پر کچھ دنوں کے لئے آ کر بسے ہوں گے۔'' (کالی داس-گرنتھاولی،ص-۳۰۲،۳۰۳)

اقبال کی نظم ہمالہ اور ابرِ کہسار اور کالی داس کی شاہکار ''میگھ دوت'' میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔کالی داس نے اپنی اس بیانیہ نظم میں بادل کو اپنا پیغامبر بنا کر جہاں اپنی بیوی کے پاس اپنا پیغام بھیجا وہیں فطرت کا وسیع مطالعہ اور حسین منظر بھی پیش کیا۔اقبال نے بھی اپنی ان دونوں نظموں میں کالی داس کی طرح بادل اور قدرت کے مناظر کا بیان جس طرح کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کے تخیل کی پرواز کس قدر بلند ہے۔

فطرت کے حسن کی منظر کشی کی اہمیت آج کے دور میں اور بھی بڑھ جاتی ہے کیوں کہ پوری دنیا میں خلفشار برپا ہے۔انسان حیوان سے بھی بدتر شے بنتا جا رہا ہے اور انسان ہی انسان کا دشمن ہوتا جا رہا ہے۔ملحق ایٹمی ہتھیاروں کے تجربے ہو رہے ہیں اور انسانیت کو تباہ و برباد کیا جا رہا ہے۔گلوبل وارمنگ اور ماحولیاتی توازن بگڑتا جا رہا ہے جس سے کائنات کی بقا کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔اس لئے ایسے منصوبے بھی بنائے جا رہے ہیں جس سے کائنات کو محفوظ رکھا جا سکے اور فطرت کے لطیف و نازک حسن کو برقرار رکھا جا سکے۔ان منصوبوں کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اہلِ دنیا کو پھر سے فطرت کے حسین مناظر کی طرف متوجہ کیا جائے تا کہ ان کے اندر کی درندگی ختم ہو جائے اور معصومیت پیدا ہو سکے اور وہ بھی میر کی طرح یہ محسوس کر سکیں کہ:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہۂ شیشہ گری کا

Residence: 262-D, Shipra Sun City, Indirapuram, Ghaziabad-201014
Mobile No: 09911796525
Website:people.du.ac.in/~aahmad